بندر چھتوں چھتوں کودتے پھاندتے آئے۔ لگتا تھا کہ سب سڑک پہ اتر آئیں گے،
مگر بس وہ منڈیروں پہ منڈلاتے رہے، چیختے چلاتے رہے پھر ایک دم سے چپ ہو گئے
جیسے کسی خوف نے انہیں آلیا ہو۔ پھر منڈیریں خالی ہونے لگیں۔

شام ہو رہی تھی۔ موٹا بندر ابھی تک سڑک پہ پڑا تھا۔ آس پاس کی کسی منڈیر پہ کہیں کوئی بندر نہیں تھا۔ روپ نگر اپنے تین بندروں کی بھینٹ دے کر بجلی کے زمانے میں داخل ہو گیا اور بندر ایسے غائب ہوئے کہ ہفتوں تک کسی منڈیر، کسی چھت، کسی درخت پہ کوئی بندر دکھائی نہیں دیا اور تو اور کالے مندر کے بڑے پیپل پہ بھی، جہاں ہر موسم، ہر دنوں میں بندر شاخ شاخ اچکتے لٹکتے نظر آتے تھے، سناٹا تھا۔

روپ نگر کا نرجن بن اسی کالے مندر سے شروع ہوتا تھا۔ دیواروں اور گنبد پہ اتنی کائی جم گئی تھی اور جم کے کالی پڑ گئی تھی کہ پورا مندر کالا کالا دکھائی پڑتا تھا۔ اندر باہر سب سنسان جیسے صدیوں سے یہاں نہ سنکھ پھنکا ہو، نہ کسی پجاری نے قدم رکھا ہو۔ جتنا اونچا مندر تھا اتنا ہی اونچا اس کا پیپل جس کی ٹہنیوں پہ سدا بندر جھولتے رہتے سوائے ان دنوں کے جب ادھر کوئی لمبی رسی جیسی دم اور کالے منہ والا لنگور آنکلتا کہ اس کے دیکھتے ہی بندر غائب ہو جاتے۔ کالے مندر سے آگے کربلا تھی کہ سال میں ایک عاشورہ کے دن کے سوا ویران دکھائی دیتی جیسے سچ مچ کربلا ہو۔ اس سے تھوڑے فاصلے پہ ایک ٹیلہ جس پہ عمارت کے نام ایک برجی کھڑی رہ گئی تھی اور قلعہ کہلاتی تھی۔ آگے راون بن بالکل اجاڑ دور تک میدان ہی میدان جس کے بیچوں بیچ ایک بھاری بڑھ کا پیڑ کھڑا تھا۔ بستی سے نکل کر بندو اور حبیب کے ساتھ گرمی کی دوپہروں میں گھومتا پھرتا جب وہ اس طرف آنکلتا اور کالے مندر کی سرحد کو پار کر لیتا تو اسے لگتا کہ وہ کسی دوسرے براعظم میں داخل ہو گیا ہے۔ کسی بڑے جنگل میں جہاں پتہ نہیں کس گھڑی کس مخلوق سے مڈھ بھیڑ ہو جائے، اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔

کالے مندر والے بندروں سے شاد آباد پیپل سے گزرتے گزرتے وہ ٹھٹکا "یار،"
اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"کیا ہے بے؟" حبیب نے بے پرواہی سے پوچھا۔

"آدمی۔" اس نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"آدمی! کہاں؟" حبیب اور بندو دونوں ایک دم سے چونکے۔

"وہ۔" اس نے قلعے کی طرف انگلی اٹھائی جہاں ایک اکیلا آدمی چلتا نظر آ رہا تھا۔

اس نرجن بن میں آدمی! کیوں؟ کیسے؟ آدمی ہی سے یا ــــ مگر خود آدمی کے ہونے کا خوف بے پایاں تھا۔ بس وہ ایک دم سے الٹے پیروں بھاگ کھڑے ہوئے۔

بندو تو اسی گھر میں رہتا تھا کہ شریفن بوا کا پوت تھا۔ حبیب سے یارانہ تھا۔ دونوں کے ساتھ اس نے کتنی آوارہ گردی کی، کتنی دشت نوردی کی تھی۔ مگر صابرہ کے آنے کے بعد اس کی آوارہ گردی میں فرق پڑتا چلا گیا۔

صابرہ، پہلے تو اس نے اس کا صرف نام سنا تھا جب خالہ جان کا گوالیار سے خط آتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ طاہرہ اور صابرہ اچھی ہیں۔ سب سلام کہتی ہیں۔ خالہ جان گوالیار میں رہتی تھیں کہ خالو جان، جو بی اماں کے بھتیجے تھے، وہیں ملازم تھے۔ مگر ایک دن تار آیا خالو جان کے دنیا سے اٹھ جانے کا۔ امی نے روٹی پکاتے پکاتے توا الٹ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بی اماں بین کر کر کے روئیں۔

بس اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سامان اور سواریوں سے لدا پھندا اور چاروں طرف سے چادر سے تنا ہوا اکہ گھر کے پھاٹک کے سامنے آ کر رکا۔ ابا جان ایک لمبی چادر لے کر باہر آئے۔ ایک کونا اسے پکڑایا، ایک کونا خود پکڑا۔ ایک سمت میں تو اس طرح پردہ کیا۔ دوسری سمت میں کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اکے کا پردہ اٹھا۔ خالہ جان اتریں۔ خالہ جان کے ساتھ دو لڑکیاں، ایک طاہرہ باجی اور دوسری صابرہ جیسے خالہ جان

سلوکہہ کہہ پکار رہی تھیں۔ بس لگتا تھا کہ اس کے برابر کی ہے۔

پہلے تو صابرہ اس سے الگ الگ رہی۔ وہ جھینپا جھینپا سا اس سے دور پھرتا رہا مگر کنکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جھجکتا جھجکتا اُس کے قریب آیا "آؤ سبو کھیلیں۔"

"میاں ذاکر" ابا جان داخل ہوتے ہوئے بولے "لگتا ہے کہ آج بھی یہ لوگ سونے نہیں دیں گے۔"

"جی" وہ ہڑبڑا کر جنگل سے نکلا۔

"میاں یہ لوگ جلسہ کر رہے ہیں یا ہلڑبازی کر رہے ہیں۔"

"ابا جان تحریکوں میں یہی ہوتا ہے۔ جوش میں لوگ بے قابو ہو جاتے ہیں۔"

"کیا کہا، تحریک؟ یہ تحریک ہے؟ بیٹے کیا ہم نے تحریکیں دیکھی نہیں ہیں۔ تحریکِ خلافت سے بڑی بھی کوئی تحریک ہوئی ہے اور مولانا محمد علی، اللہ اللہ! جب بولتے تھے تو لگتا تھا کہ انگارے برس رہے ہیں مگر مجال ہے کہ کوئی کلمہ تہذیب سے گرا ہوا ہو۔ خیر وہ تو مولانا محمد علی تھے، ہم نے تو کبھی کسی رضاکار کو بھی تہذیب سے گری ہوئی بات کرتے نہیں دیکھا۔ انگریز کو مردہ باد کہا اور بات ختم کر دی۔" ابا جان چپ ہوئے۔ پھر جیسے یادوں میں کھو گئے ہوں، بڑبڑانے لگے "بس اس بزرگ سے ایک ہی خطا ہوئی کہ جنت البقیع کے معاملے میں ابنِ سعود کی حمایت کی تھی۔ اللہ تعالےٰ اُس کے اس گناہ کو معاف کرے اور اُس کی قبر کو نور سے بھر دے۔ بعد میں وہ خود بھی اس حمایت پہ بہت پچھتائے تھے۔"

وہ دل ہی دل میں مسکرایا، ابا جان بھی خوب ہیں۔ ابھی تک تحریکِ خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

"اور تم کیا کر رہے ہو؟"

"خیال تھا کہ صبح کے لئے لیکچر تیار کروں گا لیکن ——"

"اس شور میں کوئی کام ہو سکتا ہے۔" ابا جان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں بہت شور ہے۔ مگر جلسہ شاید آج جلدی ختم ہو جائے۔ کل تو باہر سے آئے ہوئے لیڈروں کی وجہ سے لمبا کھنچا تھا۔"

"میاں مجھے تو جلدی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔" رکے، پھر بولے "ہمارے زمانے میں بھی جلسے ہوتے تھے۔ شور ہوتا بھی تھا تو جلسے سے پہلے مقرر سٹیج پہ آیا اور لوگ مؤدب ہو کر بیٹھ گئے کیا تہذیب تھی اُس زمانے کی۔"

وہ مسکرایا۔ ابا جان تحریکِ خلافت کے زمانے سے ابھی تک باہر نہیں آئے ہیں۔ مگر جب وہ یوں سوچ رہا تھا تو اسے لگا کہ جیسے وہ بھی ابا جان کے پیچھے پیچھے گزرے زمانے میں چلا جا رہا ہے۔ کیا تہذیب تھی اُس زمانے کی۔ کبھی کوئی اونچی آواز میں بولا تو ابا جان نے فوراً سرزنش کی۔ "میاں ہم اونچا نہیں سنتے"۔ کبھی طاہرہ باجی نے تیز لہجے میں بات کی تو بی اماں نے ٹوکا "ارے لڑکی تیرے گلے میں کیا پھٹا بانس رکھا ہے۔" اور جب ساون بھادوں کی ترنگ میں طاہرہ باجی نے سہیلیوں کے ساتھ لمبے لمبے جھولے لئے تھے اور اونچی آواز میں ہنسی تھیں تو بی اماں نے فوراً ٹوک دیا تھا۔

"بیٹی یہ کیا ٹھیکرے پھوٹ رہے ہیں۔"

ساون بھادوں، جھولا، گیت، پکی نیم کی نبولی ——

"اچھا، ہم چلتے ہیں۔ نیند تو آتے گی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے ابا جان واپس جا رہے تھے۔ "اور اب تم بھی آرام کرو۔"

اس نے ان کی بات سنی ان سنی کی۔ ایک دور کی آواز اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی:

پکی نیم کی نبولی ساون کب کب آوے گا
جیوے موری ماں کا جایا ڈولی بھیج بلاوے گا

طاہرہ باجی اپنی سہیلی کے ساتھ کتنے لمبے لمبے جھونٹے لے رہی تھیں اور صابرہ کتنی حسرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسی آن باورچی خانے سے خالہ جان کی آواز آئی "طاہرہ!"

"جی۔"

"بیٹی! کب تک جھولا جھولو گی۔ کڑھائی پہ آ کے بیٹھو۔ تھوڑی سی پھلکیاں پکا لو۔"

طاہرہ باجی کے چلے جانے کے بعد وہ سلو کے پاس آیا "سلو آؤ جھولا جھولیں۔"

جب وہ صابرہ کے ساتھ لگ کر جھولے میں بیٹھا تو لگا کہ نرمی اس کے اندر اتر رہی ہے، گھل رہی ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ بس اسی طرح جھولتا رہے۔ مگر صابرہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ "ہم تیرے ساتھ نہیں جھولتے۔" وہ اچانک جھولے سے اتر پڑی۔

"کیوں؟" ہکا بکا رہ گیا۔

"بس نہیں جھولتے۔"

وہ حیران اور اداس کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا۔

"سلو۔"

"ہم تجھ سے نہیں بولتے۔"

صابرہ کو جب وہ کسی طور منا نہ پایا تو وہ اداس اداس وہاں سے چلا۔ یوں ہی اس کا رخ زینے کی طرف ہو گیا۔ زینہ چڑھ کر وہ اوپر کھلی چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کچی تھی۔ اور چونکہ مینہ کو بند ہوتے دیر ہو چکی تھی اس لئے مٹی جم گئی تھی۔ جیب سے چاقو کا وہ ٹوٹا ہوا پھل نکالا جو پنسل بنانے کے لئے جیب میں رکھا کرتا تھا۔ جمی ہوئی مٹی پر نوک کو اس طرح چلانا شروع کیا جیسے شکر پارے کاٹ رہا ہو۔ تھوڑی دیر میں صابرہ بھی بھٹکتی ہوئی وہیں آ پہنچی۔ بڑی توجہ سے اسے شکر پارے کاٹتے دیکھتی رہی۔ مگر اب وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ صابرہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ شکر پارے بناتے بناتے جب جی بھر گیا تو اپنے لئے ایک نئی مصروفیت پیدا کر لی۔ جہاں مٹی زیادہ خشک ہو گئی تھی وہاں اس نے مٹی کو کھود دیا۔ تھوڑا گڑھا بن گیا تو اپنا ایک پاؤں اس میں رکھا اوپر کھودی ہوئی ساری مٹی اس پہ جما دی۔ پھر آہستہ سے اپنا پاؤں نکال لیا۔ مٹی کا ایک غار سا بن گیا۔ صابرہ بڑی

توجہ سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی "یہ کیا ہے؟"

"قبر۔" اس نے صابرہ کی طرف دیکھے بغیر بے تعلقی سے جواب دیا:

"یہ قبر ہے؟" صابرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔"

حیرت سے قبر کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی اس طرح کہ لہجے میں گرمی آ گئی تھی "ذاکر ہمارے لئے بھی قبر بنا دے۔"

"خود بنا لے" اس نے روکھا سا جواب دیا۔

صابرہ اس کی طرف سے مایوس ہو کر اپنی قبر آپ بنانے کا جتن کرنے لگی۔ مٹی بہت ساری کھرچی۔ کھرچی ہوئی جگہ میں اپنا ننگا پاؤں رکھا۔ پھر اس پہ کھرچی ہوئی مٹی کو جمایا۔ پھر آہستگی سے پاؤں نکالا۔ پاؤں نکالتے ہی مٹی کی چھت گر پڑی۔ وہ اس کی ناکامی پہ کھلکھلا کر ہنسا۔ مگر صابرہ نے حوصلہ نہیں چھوڑا۔ دوسری دفعہ پھر اس نے کوشش کی، پھر ناکام ہوئی۔ تیسری دفعہ پھر کوشش کی اور اس مرتبہ اس نے واقعی اتنی نفاست سے پاؤں باہر نکالا کہ مٹی کا ریزہ تک نہیں گرا۔ صابرہ نے اپنی کامیابی پہ ناز کیا اور اس کی قبر پہ نظر ڈالتے ہوئے اپنی قبر کو دیکھا:

"میری قبر اچھی ہے۔"

"ہوں، بڑی اچھی ہے۔" اس نے صابرہ کا منہ چڑایا۔

"پاؤں ڈال کے دیکھ لے۔"

اس تجویز پہ وہ ٹھٹھکا۔ کچھ سوچا۔ پھر دھیرے دھیرے کر کے اس نے اپنا پاؤں بڑھایا اور صابرہ کی قبر میں کھسکا دیا۔ پھر دل ہی دل میں قائل ہوا کہ سلو سچ کہتی ہے اور اپنا پاؤں دیر تک اس نرم گرم قبر میں رکھے رہا۔

اس کے بعد اس کی طبیعت کا تکدر خود بخود دور ہو گیا۔ صابرہ سے اس کے تعلقات

پھر سے خوشگوار ہو گئے۔ جب دوسری مرتبہ بناتے بناتے صابرہ کی قبر ڈھے گئی تو اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کا گورا پاؤں صاف کیا۔ پھر جیب سے سیپ نکالی۔

"سلو سیپی لے گی؟"

"ہاں لوں گی۔" اُس نے للچائی نظروں سے سیپ کو دیکھا۔

سیپ اُس سے لے کر صابرہ نے پیشکش کی "چل جھولا جھولیں۔"

چھت سے اُترتے اُترتے انہوں نے طاہرہ باجی اور سہیلی کی آواز سنی:

اماں آڑو جامن گھلے دھرے
اماں میں نہیں کھاؤں میری ماں
اماں تتا پانی بھرا دھرا
اماں میں نہیں نہاؤں میری ماں
اماں دھانی جوڑا سلا دھرا
اماں میں نہیں پہنوں میری ماں
اماں ساجن ڈولا لئے کھڑا
اماں میں نہیں جاؤں میری ماں

وہ پلٹے اور پھر چھت پہ آبیٹھے۔ اب کیا کریں۔ اس نے ایک نئی تجویز پیش کی۔

"سلو!"

"ہوں"

"آؤ دولہا دلہن کھیلیں۔"

"دولہا دلہن؟" وہ سٹپٹا گئی۔

"ہاں جیسے میں دولہا ہوں اور تم دلہن ہو۔"

"کوئی دیکھ لے گا۔" وہ گھبرا گئی۔

بس اسی دم ایک دم سے بادل گھر جاکہ دونوں ڈر گئے اور فوراً ہی مینہ اس زور سے برسا کہ کھلی چھت سے زینے تک پہنچتے پہنچتے دونوں تر الور ہو گئے۔

مینہ کا آغاز کتنا پر شور ہوتا۔ اندر باہر سب جگہ ہلچل مچ جاتی مگر جب برسے ہی چلا جاتا ایک ہی رفتار سے تو فضا آہستہ آہستہ اُداسی سے بھر جاتی اور آوازیں خاموش ہوتی چلی جاتیں۔ شام پڑے سے کسی مور کی بھٹکی آواز دور جنگل سے آتی اور اُداس برستی شام میں اور اُداسی پھیلا دیتی۔ پھر رات ہو جاتی اور مینہ میں تر الور تاریکی گہری اور دبیز ہوتی چلی جاتی۔ رات کے بیچ جب کبھی آنکھ کھلتی تو مینہ اُسی طرح برس رہا ہوتا جیسے ازل سے برس رہا ہے۔ ابد تک برستا رہے گا۔ مگر وہ رات آوازوں سے کتنی آباد تھی۔

دیکھو شام نہیں آئے، گھیری آئی بدری
اک تو کاری رات اندھیری برکھا برسے بیری بیری
نیناں نیند نہ سہائے، گھیری آئی بدری
گھنشام نہیں آئے، گھیری آئی بدری

"ارے یہ ہند نہیں آج کی رات سونے تھوڑا ہی دیں گی۔ اُوپر سے مینہ برسے چلا جا رہا ہے۔"

"بی اماں یہ جنم اشٹمی کا مینہ ہے۔" شریفن بولنے وضاحت کی "کنہیا جی کے پوتڑے دھل رہے ہیں۔"

"ارے اب کنہیا جی کے پوتڑے دھل بھی چکیں۔ جل تھل تو ہو گئے۔" بی اماں نے کروٹ لے کر پھر سونے کی کوشش کی۔ بس اسی دم وسنتی کے چوبارے میں ڈھولک بجی۔

پانی بھرن گئی راما جمنا کنڑوا
رہیا میں مل گئے نند لال
اے نندیا موری روئے

اور کہیں دور سے آواز آ رہی تھی:

رتیا ہے مجے دار سجن آئیو کہ جائیو
پلنگ ہے لچکدار سجن آئیو کہ جائیو

سارا مہینہ جنم اشٹمی کی رات ہی کو پڑتا تھا۔ صبح جب وہ جاگا تو نہ بارش نہ بادل۔ اردگرد سب کچھ روشن روشن، دھلا دھلا۔ آسمان، پیڑ، بجلی کے کھمبے، دیواریں، منڈیریں۔

"ذاکر! چل بیر بہوٹیں پکڑیں۔"

بندو کی تجویز کے ساتھ وہ فوراً گھر سے نکل پڑا اور بیر بہوٹیوں کی تلاش میں کالے مندر سے گذر کر کربلا تک گیا۔ زمین و آسمان یہاں اس گھڑی کتنے نرم اور اُجلے تھے اور گھاس میں جا بجا کتنی بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں، نرم نرم مخمل جیسی۔ انہیں چھونے میں اسے کتنی لذت مل رہی تھی۔ نرم چیزوں کو چھونے کو اُس کا ان دنوں کتنا جی چاہتا تھا۔ مگر چھو جانے پر بیر بہوٹی پنجے سمیٹ ساکت ہو جاتی اور مری ہوئی بن جاتی۔ نرم چیزیں چھو جانے سے اتنا بدکتی کیوں ہیں، وہ سخت حیران ہوتا۔

"سلو! یہ دیکھ۔"

"ہائے اتنی بہت سی بیر بہوٹیں۔" حیرت اور مسرت سے وہ کھل اُٹھی۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ کتنی گھل مل گئی۔ ایک دم سے کتنی قریب آ جاتی تھی، ایک دم سے کتنی دور چلی جاتی تھی۔

"سلو! آ کھیلیں۔"

"نہیں کھیلتے۔"

"میرے پاس کوڑیں ہیں۔"

"میں کیا کروں۔"

"یہ دیکھ، پھرکنی۔"

"ہوں۔" اُس نے منہ چڑا دیا۔

پھر وہ اکیلا ہی پھرکنی پھراتا رہا۔ بہت دیر تک۔ پھر اپنی چکئی نکالی اور چکئی گھمانی شروع کر دی۔ چکئی گھمانے میں اُسے کتنا مزا آتا تھا۔

سنتے ہیں لیلیٰ کا یہ دستور تھا

چکئی گھماتے گھماتے ایک دم سے وہ چونکا "مجنوں آگیا۔" اور چکئی کو بھول تیر کے موافق ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ جب وہ پھاٹک میں کھڑا تھا تو دیکھا کہ صابرہ بھی برابر آ کھڑی ہوئی ہے "ذاکر! یہ مجنوں ہے۔"

"اور کیا مجنوں تو ہے ہی۔"

گریباں چاک، بال بکھرے ہوتے، ایک ہاتھ میں پیالہ، دوسرے ہاتھ میں اینٹ، پیر میں زنجیر کہ چلنے میں چھن چھن کر رہی تھی۔ رک کر کھڑا ہوا:

سنتے ہیں لیلیٰ کا یہ دستور تھا
بھیک دیتی تھی جو آتا تھا گدا
ایک دن مجنوں بھی کاسہ ہاتھ لے
جا پکارا کچھ مجھے للّٰہ دے
آئی لیلیٰ اور سبھوں کو کچھ دیا
ہاتھ سے مجنوں کے کاسہ لے لیا

ساتھ ہی اینٹ زور سے ماتھے پہ ماری کہ ماتھا خونم خون ہو گیا اور دھڑام سے زمین پہ گر کر ساکت ہو گیا۔

"ذاکر! مجنوں مر گیا؟" وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

"نہیں، مرا نہیں ہے۔"

"نہیں، وہ مرگیا۔" وہ رو پڑی۔

"ارے پگلی اس نے مکر بھر رکھا ہے۔"

"نہیں، مجنوں مرگیا۔" وہ روئے جا رہی تھی۔

مجنوں ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حیران رہ گئی۔ پیالہ سنبھال جس میں دیکھنے والوں نے کچھ پیسے ڈال دیے تھے، وہ آگے بڑھ لیا۔

"سبو! تو نے لیلیٰ مجنوں دیکھا تھا؟"

"نہیں، کیا ہوتا ہے اس میں؟"

"اس میں ماسٹر روپی مجنوں بنتا ہے اور الٰہی جان لیلیٰ بنتی ہے۔"

"پھر کیا ہوتا ہے؟"

"پھر ماسٹر روپی الٰہی جان پہ عاشق ہو جاتا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جھینپ گئے۔ پھر فوراً ہی صابرہ کے تیور بدل گئے۔ "چل بے شرم، ابھی بتاتی ہوں جا کے بی اماں کو۔"

"میں نے کیا کہا ہے؟" وہ گھبرا گیا۔

مگر ایسی بات بی اماں کو بتاتی کیسے۔ بس اس سے روٹھ گئی اور دور دور پھرنے لگی۔ وہ خود جھینپا ہوا تھا۔ اس سے آنکھ ملاتے جھجکتا تھا۔

"کوں باس، کوں باس،" ایک دم اس کے کان کھڑے ہوئے۔ قریب اور دور سے آتی آوازوں کا اس پہ عجیب اثر ہوتا تھا۔ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، وہ ان کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ "کوں باس" یہ کیا لفظ ہے، یہ کبھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ جب وسنتی کے پتا لالہ چونی مل چھت پہ کھڑے ہو کر یہ صدا لگاتے ہیں تو کوے کہاں کہاں سے آکر ان کے سر پہ منڈلانے لگتے ہیں۔ وہ تیر کی طرح اپنی چھت پہ گیا۔ پیچھے پیچھے صابرہ۔

سامنے وسنتی کی چھت پہ دو بڑی تیلیں بچھی تھیں۔ ان پہ دودھ میں پکے چاول رکھے ہوئے۔ چاولوں پہ کوے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ کوئی کوئی چیل منڈلاتی آتی اور تیل پہ جھپٹا مارتی۔ لالہ چونی مل کھڑے آواز لگا رہے تھے:

"کوں باس، کوں باس،"

اور چیل کووں کی ایک گھٹا ان کے سر پہ چھائی ہوئی تھی۔

"پتہ ہے کیا بات ہے؟" اس نے صابرہ کی حیرت دیکھ کر اسے معلومات فراہم کرنے کی ٹھانی۔ "رام چندر جی کی تیلیں صاف ہو رہی ہیں۔"

"رام چندر جی کی تیلیں؟" وہ اور حیران ہوئی۔

"ہاں اور کیا۔ جب رام چندر جی بھوجن کر چکتے تھے تو کووں کا راجہ آکے ان کا جھوٹا کھاتا تھا اور تیل صاف کرتا تھا۔"

"چل جھوٹے۔"

"اللہ قسم!"

"پوچھوں بی اماں سے؟" اور اس نے فوراً جا کر بی اماں کے کان میں پھونک دیا کہ ذاکر کیا کہہ رہا ہے۔

"بیٹے!" بی اماں نے اسے گھور کے دیکھا، "تو ہمارے گھر کیوں پیدا ہوا، کسی ہندو کے گھر پیدا ہوا ہوتا۔ باپ ہر وقت اللہ رسول کہہ رہے ہیں، پوت کی خبر نہیں کہ ہندوانی قصوں میں پڑ گیا ہے۔"

مگر بی اماں کا اب وہ چم خم نہیں رہا تھا۔ پہلے ہی کی طرح سب پہ روک ٹوک کرتی تھیں ڈانٹ ڈپٹ کرتی تھیں مگر آواز میں اب زیادہ دم نہیں رہا تھا۔ مرجھا کے بالکل منقا بن گئی تھیں۔ جیسے دھیرے دھیرے ڈھے رہی ہوں۔ "بس اب تو یہ دعا ہے کہ پلنگ پہ بیٹھ لگنے سے پہلے اللہ مجھے اٹھا لے۔"

"اے بی اماں! کیا کہہ رہی ہو۔ ابھی تو تمہیں پوتے کا سہرا دیکھنا ہے۔"

"اے شریفن بوا! ہڈی سے میڑا تو لگ گیا۔ اب میں کیا اللہ میاں کی بوریتیں سمیٹنے کے لئے جیوں گی۔"

بی اماں بے شک بہت جی چکی تھیں۔ بتایا کرتی تھیں کہ ان کے بچپن میں صرف چھوٹی بڑی میں رات کو ایک مشال جلتی تھی۔ باقی سب سڑکوں، گلیوں میں اندھیرا رہتا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے مشال رخصت ہوئی اور سڑکوں اور گلیوں میں لالٹینیں نصب ہو گئیں اور اب ان کی جگہ کھمبے کھڑے تھے اور سڑکوں پر جہاں تہاں بجلی کی روشنی نظر آتی تھی۔

بجلی تو اب مسجد میں بھی لگنے لگی تھی مگر بیچ میں ابا جان نے کھنڈت ڈال دی "یہ بدعت ہے۔" اور عصا لے کر مسجد کے دروازے پہ پاسبان بن کر کھڑے ہو گئے۔ فٹنگ کرنے والے آئے اور جھڑکی کھا کر چلے گئے۔ حکیم بندے علی اور منشی مصیب حسین نے انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک ہی جواب دیا کہ

"یہ بدعت ہے۔"

پھر سے کے تیسرے دن بی اماں کی طبیعت بگڑ گئی اور ایسی بگڑی کہ سانس چلنے لگا۔ ابا جان پہرہ چھوڑ چھاڑ گھر آئے مگر بی اماں نے ان کے آنے کا انتظار نہیں کیا۔

اگلے دن جب ابا جان فجر کی نماز کے لئے مسجد پہنچے تو دیکھا کہ بجلی لگ چکی ہے۔ یہ دیکھ الٹے پاؤں آئے اور زندگی میں پہلی مرتبہ فجر کی نماز گھر پہ ادا کی۔ پھر وہ کبھی مسجد میں نہیں گئے اور کبھی نماز گھر سے باہر نہیں پڑھی۔ ہاں صبح شام بی اماں کی قبر پہ جا کے قرآن خوانی بہت دنوں تک کرتے رہے۔

ابا جان نے روپ نگر میں پھیلتی بدعتوں کو روکنے کی کتنی کوششیں کی تھیں محرم پہ جب تاشے بجنے لگے تھے تو انہوں نے منڈھے ہوئے تاشے پھاڑ دیئے:

"تاشا بجنا از روئے شریعت حرام ہے۔ میں اسے مجلسوں اور زیارتوں کے

ساتھ نہیں بجنے دوں گا۔"

"مگر لکھنؤ میں تو ہر زیارت کے ساتھ تاشے بجتے ہیں۔"

"بجا کریں۔ لکھنؤ والے شریعت کو بدلنے کے تو مجاز نہیں ہیں۔"

اس برس تو تاشے کسی مجلس میں، کسی زیارت کے ساتھ واقعی نہیں بجے مگر اگلا برس آتے آتے ابا جان کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہر زیارت تاشوں کے ساتھ نکلی، سوائے اس زیارت کے جو کھڑکی والے امام باڑے سے نکلتی تھی کہ یہ اپنا خاندانی امام باڑہ تھا اور اس پہ ابا جان کا زور چلتا تھا اور پھر یہ زیارت کہ حضرتِ حر کی تھی، روپ نگر کے محرم کی سب سے خاموش زیارت ٹھہری۔ نہ تاشے، نہ ڈھول، نہ سوز خوانی کہ ابا جان سوز خوانی کو بھی شرع کے خلاف بتاتے تھے۔ سوز خوانی کے خلاف بھی ابا جان نے محاذ قائم کیا تو تھا مگر اس محاذ کا بھی وہی انجام ہوا جو ان کے دوسرے محاذوں کا ہوا تھا۔

روپ نگر پہ ابا جان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ بی اماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اور بستی میں بجلی آ گئی تھی۔ ابا جان بجلی کو مسجد میں آنے سے نہ روک سکے، جس طرح وہ تاشے کو محرم میں راہ پانے سے نہ روک سکے تھے۔ بجلی کے خلاف محاذ، زمانے کی بدعتوں کے خلاف ان کا آخری محاذ تھا۔ اس کے بعد وہ خانہ نشین ہو گئے۔ گھر ہی میں نماز ادا کرتے گھر ہی میں بیٹھ کر محرم کے دس دن گذارتے۔ پھر ایک روز انہوں نے جانماز پہ بیٹھے بیٹھے سفر کے لئے استخارہ کیا۔ استخارہ آ گیا، سفر کا سامان ہونے لگا۔

"امی جان ہم جا رہے ہیں؟" بی اماں کے گذر جانے کے بعد اب وہ ہر بات امی سے پوچھتا تھا۔

"ہاں بیٹا۔" امی نے افسردگی سے کہا۔ چپ ہو گئیں، پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگیں۔

"اب ہمارا یہاں کیا رکھا ہے۔ زمینیں پہلے ہی ٹھکانے لگ گئی تھیں۔ ایک ٹوٹا پھوٹا گھر رہ گیا ہے مگر خالی گھر کو لے کے چاٹنا ہے۔"

"امی! ہم ویاس پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں بیٹا! ویاس پور جا رہے ہیں۔ تمہارے چچا تائے تو سب ویاس پور ہی میں ہیں۔ بی اماں نے زمین پکڑی تھی، نہیں تو ہم تو پہلے ہی یہاں سے جا چکے ہوتے۔"

"امی! ویاس پور بہت دور ہے؟"

"ہاں دور ہی ہے۔ یہاں سے بلند شہر تک تو لاری میں جائیں گے۔ وہاں سے ریل میں سوار ہوں گے۔"

باہر اکا کھڑا تھا۔ اس کے تصور میں لاری تھی اور ریل تھی۔ وہ اجنبی سواریاں جن میں اسے زندگی میں پہلی مرتبہ سوار ہونا تھا۔ امی جتنی اُداس تھیں وہ اتنا ہی خوش تھا۔ سفر کرنے اور نئی بستی کو دیکھنے کا شوق اس کے یہاں یکایک جاگ اُٹھا تھا۔ صابرہ جانے کس وقت یہاں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس سے دور کھڑی وہ بندھتے ہوئے بستروں اور تالا لگتے بکسوں کو تکے جا رہی تھی۔ تکتی رہی، پھر اچانک پاس کھڑی خالہ جان کے دامن میں منہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔ خالہ جان نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولیں:

"اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ خالہ بی جلدی واپس آئیں گی۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ امی نے صندوق میں تالا لگاتے لگاتے کہا۔

"صابرہ!" رکیں، پھر بولیں:

"بیٹی! میں وہاں پہنچ کے جلدی تمہیں بلا لوں گی۔ بس تمہیں وہیں رکھوں گی اپنے پاس۔"

ابا جان نے بستر باندھتے باندھتے ایک نظر سسکیاں بھرتی صابرہ کو دیکھا اور پھر اپنے کام میں غرق ہو گئے۔

وہ دیکھتا رہا۔ اس کی ساری خوشی زائل ہو چکی تھی۔ ہمت کر کے آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا۔ "سبو۔"

صابرہ نے بھیگے چہرے کے ساتھ (اتنی دیر میں اس کے سارے گال آنسوؤں میں تر بتر ہو گئے تھے) اسے دیکھا اور ایک دم سے پھر منہ خالہ جان کے دامن میں چھپا لیا اور پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ سسکیاں لینے لگی ——

"میاں ذاکر! یہ کیا ہو رہا ہے۔" ابا جان پھر اُس کے کمرے میں چلے آئے تھے۔

"جی، کچھ نہیں۔" اس نے اس طرح کہا جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے اور فوراً کتاب کھول کے سامنے رکھ لی جیسے جتا رہا ہو کہ وہ اصل میں کتاب پڑھ رہا تھا۔

"کچھ تو ہوا ہے۔ بہت شور پڑ رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ گولی چلی ہے۔ کچھ آواز سی آئی تھی۔"

اس نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی اور سامنے جلسہ گاہ پہ نظر ڈالی۔ کچھ لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ رضاکار قسم کے نوجوان کھڑے ہو جانے والوں میں سے کسی کو زبردستی بٹھانے کی اور کسی کو باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیچ مجمع میں دو ٹولیاں بننے لگی تھیں۔ پھر ایک دھماکہ ہوا۔ اس نے بیزاری کے ساتھ کھڑکی بند کی اور واپس ہوتے ہوئے ابا جان کو اطلاع دی:

"گولی نہیں چلی، پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"تاکہ جلسہ درہم برہم ہو جائے۔"

"کیا ہو گیا ہے لوگوں کو۔"

"ابا جان! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ آج کل کے جلسوں کا یہی معمول ہے۔ آپ اب سو جائیں۔"

"بیٹے تمہیں پتہ ہے کہ میری نیند ایک دفعہ اچٹ جائے تو پھر مشکل ہی سے آتی ہے۔"

چپ ہوئے، پھر بڑبڑائے:

"پاکستان پہ اللہ رحم کرے۔ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔"

اور بڑبڑاتے ہوئے نکل گئے۔

اس نے اُٹھ کر پھر کھڑکی تھوڑی کھول کر جھانکا۔ کھڑے لوگ بیٹھ گئے تھے۔ مگر شور اب بھی ہو رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کی، بجلی گل کی اور بستر پہ جا لیٹا۔

" لوگوں کو کیا ہو گیا ہے "

ابا جان کا فقرہ ذہن میں گونجا۔ واقعی، لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ اس نے سنجیدگی سے سوچا۔ گھروں میں، دفتروں میں، ریستورانوں میں، گلیوں بازاروں میں سب جگہ ایک ہی نقشہ ہے۔ بحث پہلے نظریاتی، پھر ذاتی، پھر تو تکار، پھر گالم گلوچ، پھر سر پھٹول۔ راہ چلتے لوگوں کا ٹھٹک کر کھڑے ہو جانا، لڑنے والوں کو دہشت سے تکنا، پھر ایک دوسرے سے پوچھنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ ہر ایک کی آنکھوں میں ایک خوف۔ جیسے واقعی کچھ ہونے والا ہے۔ پھر اپنی اپنی راہ چل پڑنا اور بھول جانا کہ کچھ ہوا ہے۔ جیسے کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی تشویش اور اتنی بے اعتنائی۔ یکایک کوئی افواہ جیسے دفعتاً آندھی لوگوں کو آ لیتی ہے۔ چہروں پہ پھیلتا ہوا خوف و ہراس۔ پھر وہی تشویش بھرا سوال کہ پاکستان میں کیا ہونے والا ہے؟ پھر اپنی اپنی راہ چل پڑنا اور بھول جانا۔ جیسے کچھ نہیں ہوا ہے، جیسے کچھ نہیں ہوگا۔ مگر کیا واقعی کچھ ہونے والا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ آگے کچھ نظر نہیں آتا تو پیچھے چل پڑنا۔ پھر وہی یادوں کی گھنی بنی میں لمبا سفر۔ جب میں روپ نگر میں تھا ——— میری زندگی کا دیومالائی زمانہ۔ پھر جب میں ویاس پور آیا ——— ویاس پور ———

" یہ مردہ چل رہا ہے؟ "

" ہے ہے، یو مرگھٹ ہے اور جی یو مردہ جو ہے یو جندہ ہے۔ "

" چل چھوٹی۔ "

" رام کسوں! جندہ ہے۔ اُٹھ کے کھڑا ہو گیو ہے رام! موری تو سیام گئی۔ "

" اچھا پھر؟ "

" پھر وے لیٹ گیو اور ماں واں سے بھاگ آئی۔ "

" جھوٹی۔ "

وہ ببلو کے ایسے کسی بیان پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اب وہ بچہ تھوڑا ہی تھا۔ بی اماں کے گزر جانے اور روپ نگر سے نکل آنے کے بعد وہ جیسے ایک ساتھ بڑا ہو گیا تھا۔ جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا۔ روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔ کچے پکے رستے جو جانے کہاں جا کر نکلتے تھے، بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈولتے ہچکولے کھاتے اکے، اونگھتی رنگیتی بیل گاڑیاں، کوئی کوئی رتھ کہ اس میں جتے توانا بیلوں کی گردنوں میں آویزاں گھنٹیوں اور گھنگھروؤں کی بدولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے۔ کالا مندر، کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل، کربلا کی ویران اور اداس فصیل، ٹیلے والا قلعہ، راون بن، راون بن کے بیچ کھڑا بھید بھرا برگد، بس ایک پورا دیومالائی عہد تھا جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا تھا۔ یہاں ہر چند کہ سامنے مرگھٹ تھا اور مرگھٹ میں کھڑے گھنے پیپل کے پیڑ مگر اسے وہاں کسی پیڑ سے اردگرد بھید بھری فضا کا احساس نہیں ہوا، حالانکہ ببلو نے وہاں بہت کچھ دیکھا تھا۔

" موکو تو بھیا چڑیل نے پکڑ لیو۔ "

" چل چل بکواس مت کر۔ "

" رام کسوں! دوپہر یا ٹیکم ٹیک۔ وے جو پیپل دکھائی دیوت ہے، وا کے تلے ایک کلھیا میں چون کا پتلا اور سیندور اور نمک کھانڈ۔ اور پیڑ کے تلے ایک بیر بانی دانت نکوسے ایسی کلکلاوے جیسے چیل کلکلاوے ہے۔ "

" بکواس مت کر، جا اپنا کام کر۔ "

وہ ویاس پور میں کچھ اور دیکھ رہا تھا۔ ہموار سڑکوں پہ دوڑتے ہوئے ریڑھے، تانگے، بیچ بیچ میں کوئی بگھی، کوئی موٹر کار۔ ان سڑکوں سے آگے بازاروں اور محلوں سے

پرے تارکول والی وہ چکنی چکنی سرمئی سڑک جس پہ دن بھر لاریاں دوڑتی رہتیں۔ ان سواریوں سے عجب سا شور پیدا ہوتا تھا۔ وہ آوازیں اب کہاں تھیں جو روپ نگر کی فضائیں بسی ہوئی تھیں۔ اب اس کے کان نئی آوازوں سے آشنا ہو رہے تھے۔ بگھیوں اور تانگوں کی گھنٹیوں کی آوازیں۔ لاری کے ہارن کی آواز، موٹر کار کے ہارن کی آواز اور سب سے عجب ریل کی سیٹی کی آواز جو اسے روپ نگر سے دور لے آئی تھی اور ویاس پور سے پرے لئے جا رہی تھی۔ ان جانے، ان دیکھوں شہروں کی طرف۔ دور پرے سے آتی ریل کی سیٹی کی آواز کے ساتھ وہ کوٹھی کی چھت پہ پہنچا۔ جہاں سے مرگھٹ کے اس طرف پھیلی ہوئی ریل کی پٹڑی صاف دکھائی دیتی۔ ریل گاڑی دور سے سیٹی دیتی اور دھواں اگلتی آتی، پہلے درختوں کی اوٹ میں دوڑتی رہتی، صرف اس کا دھواں فضا میں پھیلتا نظر آتا، پھر اچانک درختوں کی اوٹ سے وہ کالا بھنورا لچکن نمودار ہوتا جو اپنے سے بھی زیادہ کالا دھواں آسمان کے رخ اگل رہا ہوتا اور اس کے پیچھے سواریوں سے بھرے ان گنت ڈبے۔ کس تیزی سے یہ ڈبے گزرتے چلے جاتے اور دم کے دم میں نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ وہ حیران رہ جاتا۔ پھر جب ابا جان کی بتائی ہوئی یہ بات اس کے دھیان میں آتی کہ یہ ریل گاڑی مراد آباد سے آ رہی ہے اور ویاس پور سے ہوتی ہوئی دلی جا رہی ہے تو وہ اور حیران ہوتا۔

وہ یہاں خان بہادر تایا کی کوٹھی میں آکر رہا تھا جو آبادی سے کسی قدر دور کھیتوں اور باغوں کے بیچ کھڑی تھی کہ اس کی چھت پہ کھڑے ہو کر دیکھو تو سامنے مرگھٹ سے پرے ریل کی پٹڑی، ریل کی پٹڑی سے پرے افق کی حدوں پر قطار میں کھڑے ہوئے درخت۔ پھر جب وہ بازار جاتا تو ایک ایک دکان کو تعجب سے دیکھتا۔ کھڑکی بازار روپ نگر کی چھوٹی بزریا کے مقابلے میں کتنا بڑا بازار تھا۔ ایک دکان پہ سائیکلیں ہی سائیکلیں۔ اتنی سائیکلیں اس نے کبھی کاہے کو دیکھی تھیں۔ سائیکلوں، جوتوں اور کپڑے کی دکانوں

سے آگے وہ لمبا چوڑا چوک تھا۔ جہاں جا بجا گیہوں اور کپاس کے اونچے اونچے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور آس پاس جنگلی کبوتروں کی پوری برات اتری ہوئی تھی۔ دکانیں جن میں مال و اسباب کچھ نہیں، بس چاندنی بچھی ہوئی، چاندنی پہ مسند، مسند پہ بیٹھا ہوا سیٹھ، اس کے آگے ٹیلی فون رکھا ہوا۔ ایک ساتھ شور پڑتا اور ہر سیٹھ، ہر لالہ تیزی سے ڈائل گھماتا اور فون پہ زور زور سے باتیں کرتا۔ وہ ششدر رہ جاتا۔ رفتہ رفتہ اسے پتہ چلا کہ یہ شور اس وقت پڑتا ہے جب کسی جنس کا بھاؤ کھلتا ہے۔

بازار میں اتنا شور، کوٹھی کے آس پاس اتنی خاموشی! جب ریل گاڑی آتی تب ہی یہ خاموشی ٹوٹتی۔ اس کے گزر جانے کے بعد پھر خاموشی اور دور تک پھیلی ہوئی ریل کی پٹڑی جسے وہ چھت سے کھڑا دیر تک حیرت سے تکتا رہتا۔ اس کی حیرتیں بھی اب سفر کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھیں اور کس قدر بدل گئی تھیں۔

خان بہادر تایا نے یہ کوٹھی یہ سوچ کر بنوائی تھی کہ وہ پنشن ہو جانے کے بعد یہاں آکر رہیں گے۔ رائے سینا میں عمر گزارنے کے بعد وہ ویاس پور کی گلیوں میں تو نہیں رہ سکتے تھے۔ مگر وہ تو پنشن پانے سے پہلے ہی دنیا سے گزر گئے۔ یہ واقعہ اس کے ویاس پور آنے سے بہت پہلے گزر چکا تھا۔ اس نے خان بہادر تایا کو نہیں دیکھا تھا مگر ویاس پور آکر پورے خاندان پر ان کی عظمت کے سائے کو منڈلاتے دیکھا۔

"پھر بھائی خان بہادر مرحوم نے یہ ترکیب کی کہ باغی بن کے باغیوں میں مل گئے ایسے زبردست باغی بنے کہ ان کی کمیٹی کے صدر بن گئے۔ مگر باغیوں کے بھی جاسوس لگے ہوئے تھے۔ ایک جاسوس نے انہیں تاڑ لیا۔ بیچ کمیٹی میں اس نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ یہ شخص تو انگریزوں کا جاسوس ہے۔ بس پھر کیا تھا، باغیوں نے بھائی جان پہ پستول تان لئے۔"

چچا جان بولتے بولتے رکے۔ اچھے بھائی، نجیب بھائی، صاحب میاں سب بہت یکسوئی سے سن رہے تھے۔

"پھر کیا ہوا؟"

"اجی بھائی جان مرحوم کب چوکنے والے تھے انہوں نے ایسی تقریر کی کہ باغیوں کے پستول اسی باغی کی طرف مڑ گئے۔ جس نے انہیں انگریزوں کا جاسوس بتایا تھا۔" چچا جان رکے، پھر بولے کہ

"یہ باغی اتنے خطرناک تھے کہ بھائی خان بہادر مرحوم نے انہیں نہ پکڑا ہوتا تو وہ انگریزوں کا وہ حال کرتے جو سن ستاون میں ہوا تھا۔ دہشت پسند تھے سارے ہندوستان میں انہوں نے تہلکہ ڈال رکھا تھا۔"

خاندان میں جب کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی اور سب خاندان والے اکٹھے ہوتے تو بس چچا جان اسی طرح خان بہادر تایا کی باتیں شروع کر دیتے تھے اور بیٹے، بھانجے بھتیجے ارد گرد اکٹھے ہو جاتے اور اس طور سنتے جیسے کسی دیومالائی ہیرو کے قصے سن رہے ہیں۔

"بھائی خان بہادر مرحوم کی ایک ٹانگ چاندی کی تھی۔"

"چاندی کی ٹانگ؟" نجیب بھائی نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں! بات یہ ہوئی کہ انہوں نے سلطانہ ڈاکو کا پیچھا کرتے کرتے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پھر لاتے سینا میں وائسرائے کے سرجن نے ان کا علاج کیا اور پوری ٹانگ نکال کے چاندی کی ٹانگ لگا دی۔"

سب حیرت میں غرق ہو گئے۔ پھر نجیب بھائی نے پوچھا:

"تو سلطانہ ڈاکو کو تایا جان نے پکڑا تھا؟"

"اور کس نے پکڑا تھا؟ بیگ صاحب کے تو والد ماجد بھی آ جاتے تو سلطانہ کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔ یہ بھائی خان بہادر ہی کی ہمت تھی کہ اسے پکڑ لیا اور ریشمیں رومال والوں کو کس نے پکڑا تھا؟"

"ریشمیں رومال والے؟ وہ کون تھے؟"

"ریشمیں رومال والے کون تھے؟" چچا جان ہنسے:

"بیٹو تمہیں معلوم کیا ہے؟ ریشمیں رومال والوں نے انگریز کا تختہ الٹنے کا پورا منصوبہ بنا لیا تھا۔ عین وقت پہ بھائی خان بہادر مرحوم نے تاڑا اور ریشمیں رومال بیچ میں سے اچک لیا۔"

رکے، پھر کہنے لگے:

"انگریزوں پہ بھائی خان بہادر مرحوم کے بہت احسانات ہیں۔ جب ہی تو ان کے مرنے پہ وائسرائے نے کہا تھا کہ خان بہادر کے مرنے سے میری کمر ٹوٹ گئی۔"

"بھیا! اپنے اس بھتیجے سے بھی تو پوچھو کہ اسے تایا کی طرح کچھ بننا ہے یا ڈنڈے ہی بجانے ہیں۔"

"بیٹے ذاکر! جواب دو، بھابی جان کیا پوچھ رہی ہیں؟ ایک بات ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ بھائی خان بہادر آسانی سے خان بہادر نہیں بن گئے تھے۔ محنت انہوں نے کتنی کی تھی۔ جس محنت سے انہوں نے پڑھا تھا اس محنت سے آج کوئی پڑھ سکتا ہے؟ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ان کی لالٹین کا تیل ختم ہو گیا۔ تیل کی بوتل جا کے دیکھی تو وہ خالی پڑی تھی۔ انہوں نے کیا کیا کہ جگنو پکڑ کے بی اماں کے دوپٹے کے آنچل میں باندھے اور ان کی روشنی میں صبح اذان کے وقت تک پڑھتے رہے۔ آج کوئی اس بات کا یقین کرے گا؟ مگر پھر اس محنت کا انہیں صلہ ملا۔ میٹرک کے امتحان کا جب نتیجہ آیا تو وہ یو۔پی۔ میں اول تھے۔"

محنت سے تو وہ بھی پڑھ رہا تھا۔ میٹرک کا امتحان سر پہ تھا۔ رات رات بھر لالٹین جلائے بیٹھا رہتا اور دن میں دن بھر سکول کے احاطے میں کھڑے آم کے پیڑ کے نیچے پڑاؤ ڈالے رہتا۔ امتحان کی تیاری کے لیے سکول بند تھا۔ کلاسوں کے کمرے

مقفل، برآمدے خالی، قبلۂ میں سناٹا۔ پڑھنے کے لئے یہ کتنی سازگار فضا تھی۔ سکول کے اکلوتے آم کی چھاؤں میں وہ اور سربلند دونوں یکسوئی سے پڑھتے رہتے۔ جب تھک جاتے تو سامنے کی اس تارکول والی سڑک کو تکنے لگتے جس پہ کبھی کبھی کوئی لاری گزرتی نظر آتی اور پھر سڑک خالی۔

" پتہ ہے یہ لاری کہاں جارہی ہے؟"

سربلند نے اس سے پوچھا:

"کہاں جارہی ہے؟"

"میرٹھ۔"

" میرٹھ؟ یہ لاری میرٹھ جارہی ہے؟ تو نے میرٹھ دیکھا ہے؟ کیسا ہے میرٹھ؟" اس نے ایک سانس میں کتنے سوال کرڈالے۔

میرٹھ کو اس نے پہلے سربلند کی آنکھوں سے دیکھا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کالج سے فراغت پاکر وہ اور سربلند دونوں کمپنی باغ کی طرف چل پڑتے۔ چھاؤنی، انگریزوں کی دنیا، لمبی خاموش چکنی چکنی سڑکیں، دورویہ گھنے درختوں کے بیچ دور تک جاتی ہوئیں، گم ہوتی ہوئیں۔ کوئی گورا سفید کریچ کے جوتے اور سفید نیکر قمیض پہنے، ہاتھ میں ٹینس کا بلا سنبھالے، تیزی سے قریب سے گزرتا اور آگے جاکے کمپنی باغ کے گیٹ میں مڑ جاتا۔ سنہری بالوں، گورے چہرے والی کوئی میم برابر سے گزرتی اور وہ دونوں حد نظر تک اس کی گوری ننگی پنڈلیوں کو دیکھتے رہتے، پھر کوئی کالی آیا کسی دودھ جیسی رنگت والے بچے کو گاڑی میں بٹھلائے آہستہ آہستہ گاڑی کو دھکیلتی چلی جاتی۔

"یہاں سے،" سربلند چلتے چلتے رک کر کھڑا ہوجاتا "سن ستاون کا اندولن شروع ہوا تھا۔"

" یہاں سے؟"، وہ چکراکر اس جگہ کو دیکھتا اور سوچتا کہ اس جگہ میں کیا خاص بات ہے؟

وہ دیکھتا رہتا، سوچتا رہتا اور پھر اس جگہ کا رعب اس پہ طاری ہوتا چلا جاتا۔

" یار سربلند،" وہ چلتے چلتے یوں ہی سوال کرڈالتا " ہٹلر لندن کیسے پہنچے گا؟ بیچ میں تو سمندر ہے۔"

" استاد! ہٹلر کے پاس ایسا برادہ ہے کہ سمندر میں چھڑک دو تو وہ شانت ہوجائے اور پھر سمان بن جائے۔"

پھر واپس کالج میں جہاں ہجوم تھا، شور تھا، سربلند نہ ہوتا تو وہ لڑکوں کے اس ہجوم میں کھو جاتا۔ مگر پھر وہ پورا ہجوم کھو گیا معہ سربلند کے۔ کسی لڑکے نے برآمدے سے گزرتے گزرتے نعرہ لگایا:

" ہندوستان چھوڑ دو۔"

کلاسوں میں جاتے، کلاسوں سے نکلتے لڑکے ٹھٹکے۔ پھر ایک دم سے نعروں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

" ہندوستان چھوڑ دو ___ انقلاب زندہ باد ___ مہاتما گاندھی کی جے،"

پھر کلاسوں کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ پھر کسی نے خبردار کیا:

" وہ آرہے ہیں۔"

بھگدڑ، خالی ہوتے برآمدے، سناٹا، سناٹے میں دور سے آتی ہوئی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز۔ کالج میں گھڑ سوار پولیس آرہی تھی۔

برآمدے، کمرے، سبزہ زار، ہفتوں، مہینوں سنسان پڑے رہے۔ جہاں تہاں بیٹھے ہوئے لٹھ بردار سپاہی کبھی اونگھتے ہوئے، کبھی مستعدی سے کھڑے ہوئے بیٹھی بھر مسلمان لڑکے، پانچ سات ایک کلاس میں تو ڈھائی تین دوسری کلاس میں۔ مگر پروفیسر مکرجی اب بھی اتنی ہی گرمجوشی سے اور اتنی ہی آواز میں لیکچر دیتے جیسے کچھ نہیں ہوا ہے۔

امتحانوں کے آتے آتے لڑکے واپس آتے گئے مگر کھاگھی واپس نہیں آئی۔ پھر چھٹیاں

آگئیں۔ واپس پھر ویاس پور میں۔ موسم اب کتنا بدل گیا تھا۔ بدلتے بدلتے اتنا بدلا کہ لوئیں چلنے لگیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے گھروں کے دروازے بند ہو جاتے، بیٹھکوں میں لگی خس کی ٹٹیاں پانی میں تر بتر نظر آتیں۔ مگر پتلی گلیاں دھوپ سے ناآشنا تھیں۔ ان گلیوں میں کتنے گھر تھے کہ خس کی ٹٹی سے بے نیاز تھے۔ ڈیوڑھیوں میں عورتیں چرخہ کاتتیں، باتیں کرتی نظر آتیں۔

"تو نے دیکھا؟" سریندر نے پتھر والی گلی سے جلدی جلدی نکلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیا۔"

"چوبارے میں جو کھڑی تھی اُسے نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کون کھڑی تھی؟"

"رم جھم اور کون۔"

"رم جھم؟"

"ہاں، میں اُسے رم جھم کہتا ہوں۔ بس تو اُسے دیکھے گا تو سالے ہلاک ہو جائے گا۔"

ایک پھیرا، دوسرا پھیرا، تیسرا پھیرا، پھر نظر ہی نہیں آئی۔ "یار وہ تو غائب ہو گئی" سریندر مایوس نہیں ہوا تھا۔ بندر والے کو دیکھ کر کھل اُٹھا۔ "یار سن! اس کے ساتھ چلتے ہیں۔"

بندر والا کھڑی دوپہری میں ڈگڈگی بجاتا ایک گلی سے دوسری گلی میں، دوسری گلی سے تیسری گلی میں۔ آخر کو پتھر والی گلی میں تماشا شروع کیا۔ بندر یا نہیں مانی تو بندر نے اُسے ڈنڈے سے پیٹا، اتنا کہ روٹھ کر میکے چلی گئی۔

سریندر کی نظریں چوبارے پر جمی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ وہ بندر کا تماشا دیکھنے ضرور آئے گی۔

"ابے سالے دیکھ۔"

"کہاں؟"

"چوبارے میں، وہ کھڑی ہے۔"

اس نے دیکھا۔ سانولی رنگت، دبلا دبلا نرم نرم بدن۔

"اری ماں مُسلا۔" ایک دم سے بھڑکی اور غائب۔

پھر وہ اُسے نظر نہیں آئی۔ نہ آئے۔ سریندر نے اسے یہ تو سکھا ہی دیا تھا کہ لڑکی کو کیسے دیکھتے ہیں۔

پھر وہ روپ نگر چلا گیا۔ اسے ان چھٹیوں میں خالہ جان سے ملنے روپ نگر بھی تو جانا تھا کتنے برسوں کے بعد وہ روپ نگر کو پھر دیکھ رہا تھا۔ گڑھے پڑی سڑک اُسی طرح گرد میں اٹی، اُسی طرح جہاں تہاں پڑے ہوئے دو رویہ کنکروں کے ڈھیر، اُسی طرح اکے اونچے نیچے راستوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے اور اُسی طرح بیل گاڑیاں کچے رستوں پر رینگتی ہوئی۔ یہ تو سب کچھ اُسی طرح ہے۔ ایک اطمینان بھری حیرت کے ساتھ اس نے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ مگر سب کچھ اُسی طرح نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والے سب کے سب کتنے لمبے ہو گئے تھے۔ ان کے چہروں کی رنگت پک گئی تھی، آوازوں میں بھاری پن آ گیا تھا۔ حبیب میٹرک پاس کر کے علی گڑھ چلا گیا تھا اور اب چھٹیوں میں واپس آیا تھا تو اس کی سج دھج ہی اور تھی۔ پائجامے کا کٹ بدل گیا تھا۔ کہاں اس کے سر پر اُسترے کے بعد آم کی گٹھلی رگڑی جاتی تھی۔ اور کہاں اب اس کے لمبے لمبے انگریزی بال تھے۔ بندو کو بھی سٹریفن بولنے تالوں کا کام سیکھنے کے لئے علی گڑھ بھجوا دیا تھا۔

اور صابرہ! صابرہ اب کتنی لمبی ہو گئی تھی اور سینہ اُس کا کتنا اُبھر آیا تھا کہ ہمیشہ اُسے دوپٹے سے ڈھکے رکھتی۔ پھر بھی گول گول ابھار چھلکتے دکھائی دیتے۔ اس سے تو وہ اب آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی، جیسے وہ اجنبی ہو۔

گلی گلی، بازار بازار گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔ ایک پیاسے کی طرح کتنے دنوں کے بعد وہ اس مانوس منظر سے سیراب ہو رہا تھا۔ کس بے تابی کے ساتھ چیزوں کو دیکھ رہا تھا، بے تابی

کے ساتھ اور ہوس کے ساتھ جیسے سب کچھ نظر کی راہ اندر سمیٹ لینا چاہتا ہو۔ چیزیں کبھی اُسی طرح نظر آئیں، کبھی بدلی بدلی۔ بجلی کے کھمبے کتنے زیادہ ہوگئے تھے اور بجلی کے تار کتنے پھیل گئے تھے کہ چھوٹی بنڈریا کے سوا بھی پھیلے نظر آتے تھے۔ بندر تاروں سے بچ کر ایک کوٹھے سے دوسرے کوٹھے پر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ روپ نگر کے بندروں نے بجلی کے زمانے میں جینا سیکھ لیا تھا۔

کالے مندر سے کربلا تک، کربلا سے قلعے تک، قلعے سے راون بن تک سب کچھ اُسی طرح تھا۔ دیر تک وہاں گھوما، اس منظر میں اشنان کیا، پر پوری آسودگی نہیں ملی۔ جیسے وہ پُراسراریت جو یہاں رچی بسی تھی، رخصت ہو گئی ہو۔ دور کھڑے ہو کر کالے مندر کو، اس کے بڑے پیپل کو اور اس موٹے بندر کو جو سب سے اوپر والی ٹہنی پہ بیٹھا تھا، اگلے پچھلے خوف سے تجربوں کو دھیان میں لاتے ہوئے دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں کوئی "تحیر" پیدا نہ ہو سکا۔ نہ "تحیر" نہ خوف۔ سب کچھ اُسی طرح تھا۔ مگر شاید وہ بدل گیا تھا یا شاید اس کا وہ رشتہ برقرار نہیں رہا تھا۔ کالے مندر سے، بڑے پیپل سے، پیپل کے بندروں سے، کربلا کی خاموش فصیل سے، راون بن سے، اس کے بیچ کھڑے بڑ سے، شاید صابرہ سے بھی۔

ناآسودہ، نامطمئن، تھکا تھکا واپس گھر آیا۔ گرمی بہت تھی۔ تولیا لیا اور دوپہر کی دھوپ میں تپتے صحن کو عبور کر کے غسل خانے کی طرف چلا۔ غسل خانہ اب بھی اُسی پرانے انداز پہ تھا کہ اندر باہر نہ کنڈی نہ چٹخنی۔ اٹکل رہتی تھی کہ کوئی اندر ہے یا نہیں ہے۔ شاید اب اسے اٹکل نہیں رہی تھی کہ غسل خانے کے کواڑ کھولے اور پوری طرح کھولنے سے پہلے بند کر دیئے۔ آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔

دیر تک بجلی ایسے اس لمحے میں کھویا کھویا رہا۔ یہ سوچ کر حیران ہوا کہ طاہرہ باجی تو بالکل عورت ہیں۔ اس دن تو ان سے آنکھ ہی نہ ملا سکا۔ دوسرے دن آنکھ بچا کر ان کا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ وہ پنڈا گورا گورا بھرا بھرا اس کے تصور میں اُبھر آیا۔ اپنی تمام

تفصیلات کے ساتھ۔ شرم سے اُس کا منہ لال پڑ گیا۔ اپنے آپ پہ اس نے دل ہی دل میں کتنی ملامت کی۔ مگر طاہرہ باجی کو سرے سے کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس سے بے تکلفی سے باتیں کیں۔ اور کالج کی ایک ایک بات پوچھی۔

"ذاکر! تمہارے کالج کی لائبریری میں راشد الخیری کی 'شامِ زندگی' ہے؟"

"جی ہے۔"

"ہائے اللہ! ذاکر اب کے آؤ تو 'شامِ زندگی' ضرور لے کے آنا۔"

ناولوں کا ذکر ہوتے دیکھ کر صابرہ بھی جھجکتی جھجکتی آئی اور طاہرہ باجی کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ناولوں کا ذکر کتنے شوق سے سن رہی تھی۔ باورچی خانے سے خالہ جان کی آواز آئی۔

"اری طاہرہ ہنڈیا تو دیکھ لے کہیں جل نہ جائے۔ میں آٹا گوندھ رہی ہوں۔"

طاہرہ باجی کے چلے جانے پر صابرہ سٹپٹا سی گئی مگر اُٹھ کے جا بھی نہیں سکی۔ وہ خود بھی جھینپا جھینپا بیٹھا رہا۔

رفتہ رفتہ حوصلہ پکڑا:

"صابرہ! تم نے 'فردوسِ بریں' پڑھی ہے؟"

"نہیں، کیسا ناول ہے؟"

اس نے فوراً ہی "فردوسِ بریں" کا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ پورا قصہ سنا ڈالا۔

"ذاکر! ہمیں 'فردوسِ بریں' لا دوگے؟"

"ہاں جب آؤں گا تو لے کے آؤں گا۔"

"اب تم کب آؤ گے؟"

"بڑے دن کی چھٹیوں پر۔"

اس نے شہر کے اور کئی ناولوں کے قصے بھی سنائے۔ مع ان تفصیلات کے جنہیں بیان کرتے ہوئے کچھ وہ جھجکتا، کچھ وہ جھینپ جاتی مگر صابرہ اب اس کے ساتھ کھل مل گئی تھی

گھر کے کام کاج سے تو اُس کا جی کچھ اُچاٹ سا ہو گیا تھا۔ اُدھر خالہ جان اور طاہرہ باجی گھر کے کاموں میں جتی رہتیں، ادھر وہ اس کی باتیں سنتی رہتی، اس سے باتیں کرتی رہتی۔ باتیں کبھی زور زور سے، کبھی دھیرے دھیرے، کبھی اتنی دھیرے سے کہ باتیں سرگوشیاں بن جاتیں اور صابرہ کے چہرے پہ سرخی دوڑ جاتی۔ اور جب اُس نے بُندوں کی تعریف کے بہانے اس کے کان کی لو کو چھوا تھا۔ تو اس کا سانس ایک دم سے کتنا گرم ہو گیا اور کتنا تیز چلنے لگا تھا۔ کتنی نرم اور گرم تھی وہ لو کہ ایک نرم گرم رو پوروں کی راہ اس کے اندر سرایت کرتی چلی گئی۔

کتنی جلدی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ روپ نگر اسے پکڑ رہا تھا مگر اسے آخر کالج پہنچنا تھا۔ اور اس سے پہلے ویاس پور جا کر امی جان کو صورت بھی دکھانی تھی۔

"ابے تو آ گیا؟ تو تو ایک ہفتے کا کہہ کے گیا تھا اور اتنے دن لگا دیئے۔"

سرینڈر کی بات کے جواب میں اس نے پہلے کوئی ادھر کی بات کی کوئی ادھر کی مگر راز کو وہ کتنی دیر چھپا کر رکھ سکتا تھا۔

"پھر تو نے کیا کیا؟"

"میں نے کیا کیا؟ کیا کرتا؟ کچھ نہیں۔"

"جھوٹا۔"

"سچ، اس سے آگے کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"تو بہت گھامڑ ہے۔" سرینڈر نے ملامت کی اور چپ ہو گیا۔

پھر وہ آپ ہی آپ بولا:

"یار اُس کے ہاتھ بہت نرم تھے۔"

سرینڈر کی بیزاری دور ہو گئی۔

"اچھا؟"

"ہاں" چپ ہوا، خیالوں میں غوطہ کھایا، پھر بہت آہستہ سے بولا۔ "اور ہونٹ بھی۔"

"ہونٹ؟" سرینڈر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

پھر وہ کھلتا چلا گیا۔ جو یہاں پہ بیان نہیں کر سکا تھا، وہ اس نے کالج پہنچ کر جب اطمینان سے دونوں بیٹھے، بیان کیا۔ جب سب کچھ بیان کر چکا تو جو بیان کر چکا تھا۔ اسے پھر بیان کیا، اور پھر بیان کیا۔ ہر مرتبہ یوں بیان کیا جیسے پہلی مرتبہ بیان کر رہا ہے۔

"اچھا اب تو کب جا رہا ہے؟"

"کرسمس کی چھٹیوں میں۔"

"وہ تو ابھی دور ہیں۔"

"ہاں یار! وہ تو ابھی دور ہیں۔"

"خط وط لکھ اُسے۔"

"خط، ہاں یار خط لکھنا چاہیئے۔" اور خط لکھنے کا سودا دنوں ہفتوں سر پہ سوار رہا۔ روز قلم کاغذ لے کر بیٹھنا، کچھ لکھنا، پھر پھاڑ دینا۔

"یار لکھا کیا جاتے؟"

"جو لکھنا چاہیئے۔"

"مگر یار! اگر کسی اور نے خط پڑھ لیا تو؟"

"تو؟"

سرینڈر سوچ میں پڑ گیا۔

"اُس نے تجھ سے ناولوں کے لئے کہا تھا نا؟ بس تو یہ لکھ کہ مجھے ناولوں کے نام یاد نہیں رہے۔"

"بالکل ٹھیک۔"

پھر کرسمس کی چھٹیاں بھی آخر آ ہی گئیں اور اس نے راشد الخیری اور شرر کے ناول

الماریوں میں سے ٹٹول ٹٹول کر نکالے اور اپنے کارٹو پہ جاری کرائے۔

"یار تو روپ نگر تو نہیں جا رہا ہے؟"

"کیوں نہیں جاتا۔ جا رہا ہوں۔ کل کالج بند ہوتے ہی نکل جاؤں گا۔"

سریندر رکا، پھر بولا:

"یار مت جا۔"

"کیوں؟"

"یار سفر لمبا ہے اور گاڑیوں میں گڑبڑ کی خبریں آ رہی ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

یار گڑبڑ تو یہاں بھی ہوتی نظر آ رہی ہے۔"

"ہاں یہاں بھی کچھ گڑبڑ ہے۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"پھر؟"

سریندر نے سوچا، پھر کہا:

"ویاس پور چلتے ہیں، دونوں مل کر۔"

ویاس پور تک کا سفر کالے کوسوں کا سفر بن گیا۔ جو مسافر زیادہ نقل و حرکت کرتا مشکوک دکھائی دیتا۔ ویاس پور کا پلیٹ فارم کتنا خاموش تھا اور جب باہر آئے تو حیران رہ گئے۔

"یار یہاں تو کوئی تانگہ ہی نہیں ہے۔"

"پھر پیدل چلتے ہیں۔ آخر دوسرے بھی تو پیدل جا رہے ہیں۔"

تھوڑی دور تک آگے اور پیچھے گاڑی سے اترے ہوئے مسافر پیدل چلتے نظر آئے۔ پھر یکایک احساس ہوا کہ سڑک خالی ہے۔ دور تک سڑک خالی نظر آ رہی تھی۔ جگت ٹاکیز کہ اس راہ میں سب سے پرشور مقام تھا۔ بند تھا اور بالکل خاموش۔ اس کی پیشانی پہ خاصے دنوں سے جو ایک جنڈا سا کھڑا تھا اور جس پہ کانن بالا کی مورت مسکراتی رہتی تھی، وہ بیچ سڑک پر گرا

پڑا تھا۔ کانن کی تصویر پھٹ چکی تھی اور دور تک اینٹیں بکھری پڑی تھیں۔

"یار غلطی ہو گئی۔" سریندر نے آہستہ سے کہا۔

"آنا نہیں چاہیئے تھا۔"

پھر خاموش چلنے لگے۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور دور تک کوئی آدمی نہیں تھا۔ بس اینٹیں ہی اینٹیں۔ اس نے خوف و حیرت سے ان بکھری اینٹوں کو دیکھا، اتنی اینٹیں تھیں ویاس پور میں!

چلتے چلتے وہ میرٹھ دروازے پر آ گئے۔ آگے سیدھی راہ پہ کھڑکی بازار تھا جو بند پڑا تھا اور بے چراغ تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جو ہندوؤں کے محلوں میں جا نکلتا تھا۔ برابر میں ایک گلی چلی گئی تھی جو مسلمانوں کے محلوں میں جاتی تھی اس دوراہے پہ دونوں ٹھٹکے، دونوں نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا اور الگ الگ رستے پر چل پڑے ——

"ذاکر بیٹے! اسے کچھ سنا تو نے، باہر گولی چل رہی ہے۔"

"جی،" اس نے بدقت جنگل سے واپس ہوتے ہوتے امی جان کو دیکھا جن کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آواز میں سخت گھبراہٹ تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ ایک پٹ کھول کر باہر نظر ڈالی۔ جلسہ گاہ درہم برہم تھی، شامیانہ گرا پڑا تھا، قناتیں کہیں کھڑی رہ گئی تھیں، کہیں جھک گئی تھیں، شامیانے کے ایک کونے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ بھگدڑ پڑی ہوئی تھی۔ کچھ بھاگ رہے تھے، کچھ سر پھٹول کر رہے تھے۔ اس نے کھڑکی بند کی اور واپس آیا۔ بڑبڑایا "بکواس۔"

"اسے ہے میں تو سوتے سے اچھل پڑی۔ قیامت مچی ہوئی تھی۔ پھر ٹھائیں سے آواز آئی میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اب تک کر رہا ہے۔ میں نے تیرے باپ کو آواز دی کہ اجی میں نے کہا کہ سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟ وہ بڑبڑا اٹھے کہ یہ بدبخت کسی بھلے مانس کو سونے دیں گے؟ میں نے کہا کہ مجھے ایسا لگے ہے کہ گولی چلی ہے۔ بڑبڑانے لگے کہ پاکستان میں اب یہی ہو گا

میں نے کہا کہ کوئی بات ہو یہ تو بڑبڑا کے رہ جاتے ہیں۔ ذاکر کو جا کے بتاؤں ؟"

"کسی نے فائر کر دیا ہوگا۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جلسوں میں آج کل یہی ہوتا ہے۔"

"اسے بیٹے! ایسے گولیاں چلیں تو کیا ہوگا ؟"

"کچھ نہیں ہوگا۔ آپ جا کے اطمینان سے سوئیں۔"

"تجھے یقین نہ آوے گا، میں تو اندر سے ہل گئی ہوں۔ پاکستان پہ اللہ رحم کرے۔"

"امی کچھ نہیں ہوتا، آپ جا کے سوئیں۔"

امی کو جیسے تیسے رخصت کر کے اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی کھول کر باہر نظر ڈالی۔ مجمع منتشر ہو چکا تھا، گرے ہوئے شامیانے کے ساتھ جلسہ گاہ خالی پڑی تھی اور سارے بلب اُسی طرح جل رہے تھے۔ شامیانے کے جس کونے سے پہلے بہت دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اب وہاں دھوئیں کی صرف ایک لکیر سی اُٹھ رہی تھی۔

جلتی روشنی میں اُجڑی پجڑی خالی پڑی جلسہ گاہ کو دیر تک تکتا رہا۔ وہ ایک لمبا سفر کر کے آیا تھا اور اب اپنے زمانے میں سانس لے رہا تھا۔

۲

مینہ اس کے اندر رات ٹوٹ کے برسا تھا۔ یادوں کی بدلیاں کہاں کہاں سے گھر کر آئی تھیں۔ آسمان اب دھلا دھلا اور نرم نرم تھا۔ کوئی کوئی بدلی ایک آسودگی کے ساتھ تیرتی رہ گئی تھی۔ کوئی اجلا سا چہرہ، کوئی نرم سی مسکراہٹ۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں کتنا مگن تھا۔ باہر کی دنیا اس کے لئے اپنا مفہوم کھو چکی تھی۔ ناشتے کی میز پر بیٹھے بیٹھے اس نے اخبار کی سرخیوں پر بے تعلقانہ سی نظر ڈالی اور اسے ابا جان کی طرف سرکا دیا۔

ابا جان ناشتہ پہلے ہی کر چکے تھے اور اردو والا اخبار پڑھنے میں منہمک تھے۔ جب وہ میز پہ آ کے بیٹھا تو انہوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"ذاکر! کیا آج تمہیں کالج نہیں جانا ہے ؟"

"جانا تو ہے، آنکھ دیر سے کھلی۔"

"تو پھر جلدی ناشتہ کرو اور جاؤ۔" یہ کہتے کہتے پھر اخبار پڑھنے میں منہمک ہو گئے۔

اس کی آنکھ آج بے شک دیر سے کھلی تھی، پھر بھی اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ اطمینان سے نہایا دھویا، اب اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا۔

امی آئیں، چائے دانی کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔

"ٹھنڈی تو نہیں ہو گئی۔"

"نہیں، ابھی ایسی ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے، چلے گی۔" اس نے چائے دانی